مشہورِ عالم تصنیف "فاتح" کے مصنّف کی تاریخی شہادت

جنرل عبدالرحمٰن اختر شہید کی سوانح اور جہادِ افغانستان میں ان کے عظیم کردار پہ معروف صحافی جناب ہارون الرشید کی تازہ ترین شاہکار تصنیف "فاتح" سے ایک اقتباس ــــ جس سے ملکی سیاست میں جامعہ دارالعلوم حقانیہ کا جہادِ افغانستان کے سلسلہ میں ممتاز کردار اور تاریخی مساعی پر روشنی پڑتی ہے ــــ (ادارہ)

۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء کو صدر نے غیر جماعتی انتخابات کے بعد محمد خان جونیجو کو اقتدار سونپ دیا۔ رفتہ رفتہ اخبارات کو زیادہ آزادی ملی تو افغان پالیسی پر نکتہ چینی بڑھنے لگی۔ "ترقی پسند" اخبار نویس تو ظاہر ہے کہ لمبی لمبی داڑھیوں اور بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھ کر پریس کانفرنس شروع کرنے والے افغان لیڈروں کے خلاف تھے ہی، بہت سے دوسرے صحافی بھی آزادی کے لئے برسرپیکار افغانوں کے خلاف لکھ رہے تھے۔ یہ بات کسی طرح مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اس دور میں اسلام کے نام پر لوگ اپنی جانیں نچھاور کر سکتے ہیں اور یہ کہ روس ایسی عظیم قوت کو عسکری ناکامی سے دوچار کیا جا سکتا ہے۔ پاکستانی صحافت میں بائیں بازو کا پروپیگنڈہ ہمیشہ مؤثر رہا تھا اور اب یہ اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ ببرک کارمل کے اقتدار سنبھالنے کے بعد افغانستان جانے اور کئی ماہ تک پل چرخی جیل میں قید رہنے والے مختار حسن نے ایجنسی افغان پریس کے نام سے ایک مختصر سی نیوز ایجنسی قائم کی۔ لیکن اس طرح کہ اس کی اجازت حاصل کرنے کے لئے لندن میں صدر دفتر بنانا پڑا۔ یہ ایجنسی ہر روز ایک یا دو خبریں اردو اور انگریزی زبان میں جاری کرتی اور ہفتہ میں ایک آدھ فیچر۔ ان خبروں اور فیچر کی اشاعت کے لئے اخبارات سے درخواست کرنا پڑتی اور بعض اوقات اس کے باوجود ان کی اشاعت ممکن نہ ہوتی۔ ملک میں آئے روز بموں کے دھماکے ہوتے اور بے گناہ لوگ مارے جاتے تو سیاسی لیڈروں کے بیانات شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتے کہ اس کے ذمہ دار افغان مہاجر ہیں۔ لاہور کے ایک مشہور کالم نگار نے جو ۱۹۸۸ء کے آغاز میں افغانوں کو حریت پسند تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئے، افغان جہاد کی حمایت کرنے والے ایک اخبار میں لکھا: یہ کہنا مشکل ہے کہ دھماکے کون کرا رہا ہے۔ ان کا اشارہ یہ تھا کہ ممکن ہے کہ خود ضیاء الحق کی حکومت ہی ایسا کرا رہی ہو۔ دانشور حنیف رامے نے جو بعد ازاں گلبدین حکومت یار کو خراج تحسین کرتے پائے گئے، لاہور کے ایک اجتماع میں حریت پسندوں کو امریکی کارندے قرار دیا۔ جمعیۃ علماء پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ کرنل قذافی سے واسطہ رکھتے ہیں (اور اب لادین بعث پارٹی کے سربراہ صدام حسین کو صلاح الدین ایوبی قرار دے رہے ہیں) اپنی پارٹی کے پلیٹ فارم کو مجاہدین کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن مولانا عبدالستار خان نیازی؟ سے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا کر سدِّ راہ ہو گئے۔ مولانا فضل الرحمٰن افغان مجاہدین کی حمایت کرتے تھے لیکن اسی سانس میں یہ بھی کہتے تھے کہ یہ روس اور امریکہ کی جنگ ہے۔ بعد میں دیوبندی مکتب فکر کے بہت سے افراد اپنے طور پر جہاد میں حصہ لینے کے لئے افغانستان بھی گئے لیکن مولانا فضل الرحمٰن کی جماعت نے بحیثیت مجموعی اس میں وہ کردار ادا نہ کیا جس کی حکومتوں سے ٹکرانے والے ان سخت جان لوگوں سے امید کی جاتی تھی؟ **البتہ ان سے الگ ہونے والے (مولانا سمیع الحق کی قیادت میں کام کرنیوالے) درخواستی گروپ کے لوگ آواز اٹھاتے رہے۔** صدر ضیاء الحق کے پروں کے اندر پیدا ہونے والی مسلم لیگ کی حالت عجیب تھی۔ اسے مرکز اور چاروں صوبوں میں اقتدار حاصل تھا لیکن وہ پاکستان کے لئے زندگی اور موت ایسی اہمیت رکھنے والے اس معاملے سے لاتعلق تھی۔ سرحد اور بلوچستان میں اس کے وزرائے اعلیٰ ارباب جہانگیر اور جام آف لسبیلہ سرکاری طور پر تو افغان مجاہدین کی حمایت کرتے لیکن بند کمروں کے اجلاسوں اور نجی گفتگوؤں میں سے اظہار بیزاری کرتے۔ اسلام آباد میں ایک مسلم لیگی رکن قومی اسمبلی نے ایک روز اپنے دوستوں سے کہا "معلوم نہیں افغانستان کے سلسلے میں ان دنوں حکومت کی پالیسی کیا ہے؟" طرفہ تماشا یہ تھا کہ جونیجو کو اس سلسلے میں بنیادی پالیسی سے تو آگاہ کر دیا گیا اور ظاہر ہے کہ ان کے لئے اس کی حمایت کے سوا کوئی راستہ نہ تھا، مگر انہیں مسلسل اعتماد میں لینے اور تصویر کے اندر رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ خود انہیں بھی اس سے دلچسپی نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سال بھر تو وہ صورت حال کو سمجھ ہی نہ سکے۔ بعد میں جب خطرناک مرحلہ آیا تو وہ ضیاء الحق سے الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ تو اس مجبوری سے کہ ایک خفیہ آپریشن تھا اور کچھ اس سبب سے کہ اس طرح کے نظام حکومت میں عوامی رائے کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، پاکستانی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے کبھی استعمال نہ کیا گیا اور جب ضرورت محسوس کی گئی تو وقت گزر چکا تھا۔ (فاتح صفحہ ۱۸۸ تا ۱۹۰)